علی گڑھ کا ایک یادگار کانووکیشن ایڈریس

ڈاکٹر ذاکر حسین

۱۹۵۷ء

ایک طالب علم علی گڑھ کے سرسید ہال (کچی بارک) میں داخلے کے لئے ۱۹۱۳ء میں پہنچا۔ ۱۹۲۰ء میں گاندھی اور مولانا محمد علی اوران کی قیادت میں تحریک آزادی، پھروہ ۱۹۲۶ء، ۱۹۲۷ء میں جامعہ ملیہ کا وائس چانسلر ہوا، اور ۱۹۵۰ء میں علی گڑھ کا وائس چانسلر ہوا، پھر یہ علی گڑھ کا چانسلر۔ جب علی گڑھ چھوڑ کے جامعہ ملیہ کے کیمپس میں، اپنے گھر میں ایک پرائیویٹ سٹیزن کی حیثیت سے سال چھ مہینے گزار رہا تھا تو اور بیچ بیچ میں ادھر ادھر یورپ/ جرمنی میں گھوم رہا تھا، اور جواہر لال نے جرمنی کے سفیر کو مامور کیا کہ ذاکر صاحب کو راضی کیا جائے کہ وہ بہار کی گورنری قبول کرلیں، اور جب گورنر بہار کچھ دن بعد علی گڑھ میں کانووکیشن ایڈریس دینے آیا تو کیا کیفیت اس پر گزری ہوگی جب وہ یہ ایڈریس، علی گڑھ کا ایک سابق طالب علم، اب گورنر بہار، یہ کانووکیشن ایڈریس دے رہا تھا، اور علی گڑھ سے کہہ رہا تھا کہ:

پیشکش: **پروفیسر پرویز طالب**، پروفیسر، شعبہ بزنس ایڈمنسٹریشن، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

جناب[1] والا، جناب شیخ الجامعہ[2]، بزرگو، دوستو اور عزیزو!

میں کس طرح اپنی شکر گزاری کا اظہار کروں اس اعزاز پر، جو آپ نے مجھے بخشتا ہے۔ اس کا مستحق ہونا، بفرضِ محال، اور آپ بخشتے تو بھی شکر گزار ہونا چاہیے تھا، لیکن آپ نے تو میری نا اہلی سے چشم پوشی فرما کر مجھے یہ عزت بخشی ہے۔ اس کی وجہ تو آپ کی محبت ہی ہوسکتی ہے اور محبت سے محبت پیدا ہوتی ہے اور شکر گزاری۔ پھر اس مضمون رنگین کے ادا کرنے میں لفظوں نے کب کب اور کیا کیا شکستیں نہیں کھائی ہیں؟ اب بھی یہ اپنی ہار مانتے ہیں۔

جناب شیخ جب جناب والا کی خدمت میں پیش کرتے ہوئے میرا تعارف کرا رہے تھے تو میں سوچتا تھا کہ کیا میں کوئی اجنبی ہوں جس کا یوں تعارف کرایا جارہا ہے۔ اور مجھے میر کا وہ مشہور شعر یاد آرہا تھا جسے مطابق حال بنانے کے لیے دوسرے مصرع کو ذرا بگاڑنا پڑتا ہے:

پتا پتا بوٹا بوٹا، حال ہمارا جانے ہے

یہ کیسے کہوں "جانے نہ جانے گل ہی نہ جانے" کہ گل تو خوب جانتا ہے، اس لیے یوں کہوں گا:

گل بھی خوب ہی جانے ہے ہم کو، باغ بھی سارا جانے ہے

پھر بھی جی چاہتا ہے کہ میں اس دانش گاہ کے اور اپنے تعلق کو جس طرح محسوس کرتا ہوں اُس کا کچھ ذِکر آپ سے کروں۔

میرا دھیان اس وقت ۴۴ برس پہلے کی اس گرم دوپہر کی طرف رہ رہ کر جاتا ہے، جب میں پہلی بار اس دانش گاہ میں پہنچا تھا۔ اپنے دوسرے سیکڑوں ساتھیوں سے ذرا کم اجنبی، کہ میرے دو بڑے بھائی پہلے سے یہاں موجود تھے۔ یہ دونوں یہاں رہ بس کر یہاں کے ہو چکے تھے، میں نو وارد تھا۔ سہ پہر میں شہر سے ایک جوتا، کچھ کتابیں اور ایک لالٹین بھائی صاحب نے مجھے خرید وادی تھی۔ شہر گئے تھے ہم پیدل، ادھر سے آئے تھے اکے میں، اس لیے کہ ہاتھ میں سامان اٹھا کر چلنا اس زمانے میں کسرِ شان سمجھا جاتا تھا! مجھے یاد ہے کہ بھائی صاحب مجھے اپنے کچی بارک کے کمرے میں چھوڑ کر اپنے دوستوں سے ملنے چلے گئے تھے اور مجھے بتا گئے تھے کہ مغرب کے بعد جب گھنٹی بجے تو ڈائننگ ہال میں کھانا کھانے چلے جانا۔ گھنٹی بجی، میرے اندازے سے ذرا پہلے۔ میں نے کرتر کی ٹوپی، ترکی کوٹ اور جراب اور انگریزی جوتے پہنے بغیر کھانا کھانے کی مشق ۱۶ برس تک بہم پہنچا چکا تھا، یہ نئی وردی پہننے میں دیر لگی، اور دیر کیسے نہ لگتا، جوتے کا فیتہ ایک سوراخ سے کھینچا تو دوسرے سے نکل گیا، اس میں سلیقے سے گرہ دینے کا جو فن سہ پہر میں بھائی صاحب نے سکھایا تھا اور جس کی کچھ مشق بھی اس نئے جوتے پر کرا دی تھی وہ گھبراہٹ میں سب ذہن سے اُتر گیا اور کئی بار کے بست و کشاد سے ایک نئے انکشاف کی طرح ہاتھ آیا۔ لیکن جب کس بندھ کر کمرے سے نکلا تو دیر ہو چکی تھی اور دوسرے زیادہ چوکس ساتھی ڈائننگ ہال جا چکے تھے۔

یک لحظہ غافل بودم و صد سالہ راہم دور شد

راستہ معلوم نہ تھا، نہ جانے کتنی دیر اِدھر اُدھر گھومتا پھرا اور اپنے خیال میں تلاشِ منزل کی ناکام کوشش کے بعد پھر اپنے ہی کمرے کے سامنے آن پہنچا۔ کمرہ بند تھا، دوسرے کمرے بھی سب بند تھے۔ گھڑی دیکھی، یہ بھی اسی دن نئی نئی بھائی صاحب نے دی تھی۔ اس سے پہلے اسکول کے گھنٹے یا سورج کی مدد سے دن کی تقسیم کر لیا کرتا تھا۔ گھڑی جو دیکھی تو معلوم ہوا کہ کھانے کی گھنٹی کا جو وقت بتایا گیا تھا اُسے گزرے صرف آٹھ منٹ ہوئے ہیں۔ اور اس جانِ ناتواں نے اس آٹھ منٹ میں خود فراموشی، بازیافت، تلاشِ منزل، گم کردہ راہی اور ناکامیِ سفر کے جملہ مقامات طے کر لیے تھے!

سچ ہے، وقت صرف گھڑی کی سوئیوں ہی سے نہیں ناپا جاتا، جس پر یہ گزرتا ہے اس کی کیفیت بھی اس کا ایک پیمانہ ہے؛ کبھی چند منٹ، انتظار اور مایوسی کے چند منٹ، پہاڑ بن جاتے ہیں؛ کبھی کشفِ حقیقت، قصدِ نیک، مشاہدۂ جمال، مجاہدانہ سرفروشی کے ایک لمحے میں ازل اور ابد سمٹ کر سما جاتے ہیں؛ کبھی بے مقصدی، بے راہ روی، بے دلی میں پوری پوری عمر بیت جاتی ہے کہ گھڑی کا ایک منٹ بھی اس پر حقارت سے ہنستا ہے۔ خیر، تو ہم آٹھ منٹ بعد جہاں سے چلے تھے وہیں پہنچ گئے، چارپائیاں باہر نیم کے درختوں کے قریب پڑی تھیں، وہاں بیٹھے ہی تھے کہ دوسرے ساتھی کوئی ہاتھ میں ہاتھ ڈالے، کوئی گنگناتے، کوئی ہنستے، کوئی ذرا چُپ چُپ، واپس آنے لگے یعنی جانا، کھانا، آنا، سب ۹-۱۰ منٹ میں ختم۔ اس زمانے میں اور چیزوں میں تو نہیں البتہ کھانے میں، بہت ہی فوجی شان تھی اس پر زیادہ وقت صرف کرنا بدذوقی سمجھا جاتا تھا اور منتظمین کی طرف سے بھی ایسا اہتمام تھا کہ زیادہ وقت صرف کرنے کا موقع بھی کم ہی ہوتا تھا۔

یہ اس دن کی یاد اس تفصیل سے کیوں آرہی ہے آج؟ شاید اس لیے کہ وہاں سے وہ زندگی شروع ہوتی ہے جس نے ۴۴ برس میں بہت سے رنگ دیکھے، مگر جس میں اس دانش گاہ سے برابر دل کو تعلق رہا، گہرا تعلق، نہ ٹوٹ سکنے والا تعلق۔ یہاں بہت کچھ سیکھا اور زیادہ نہ سیکھ سکنے پر دلگیر ہونا سیکھا، ساری زندگی کو یہاں کے ناتمام کام کا تتمہ بنانے کا ولولہ یہیں سے پایا، یہاں دوست پائے، دوستی کی قدر پہچانی، مل جل کر کام کرنا سیکھا؛ اختلاف کے باوجود نباہ کے ڈھنگ سیکھے؛ بھانت بھانت کی زندگی کے نمونوں کو برتنا اور پرکھنا سیکھا؛ اپنی قومی زندگی کے سارے عیب یہاں برملا دیکھے، پر اس کے پچھتاوے کے آنسوؤں سے اپنی آنکھیں بھی نم پائیں؛ اس کی ساری آرزوؤں اور تمناؤں کا نقش بھی یہیں اپنے دل میں اُبھرتا ہوا محسوس کیا؛ اپنی خام تُند مزاجیوں اور عاجلانہ بدگمانیوں پر نادم ہونا سیکھا، سوکھے پتوں کی طرح ایک چنگاری سے شعلے کی طرح بھڑک بھی اٹھے، مگر سچے کوئلے کی طرح سلگتے رہنے کا سبق بھی یہیں سے ملا؛ صلاحیتوں کی جھجکتی کونپلوں کو نشوونما دے سکنے کے لیے ان میں زندگی کی تُند اور تیز ہواؤں سے بچانے کی حکمت، مگر غیرت کی تعمیر کے لیے جماعتی زندگی کی ریل پیل میں مردانہ وار

---

[1] پرو چانسلر نواب محمد احمد سعید خاں چھتاری [2] وائس چانسلر کرنل بشیر حسین زیدی

شامل ہونے کی ضرورت، بھی یہیں پہچانی ؛ خلوت وجلوت کی جدا جدا تعلیمی اور تربیتی تاثیروں کا یہیں پہلی بار تجربہ کیا ؛ یہاں فرماں برداری سیکھی، اطاعت شعاری سیکھی ؛ ادب سیکھا، بڑوں کا ادب، ہم چشموں کا ادب، چھوٹوں کا ادب اور خود اپنا ادب ؛ سعادت مندی اور وفاشعاری کے ساتھ خود اختیارانہ اس علمی بستی کے نظام کی پابندی کو عین آزادی جانا ؛ پر جب اس نظام کو ضمیر کے مطالبوں سے ٹکراتا پایا تو اس سے بغاوت کی طاقت بھی اسی چشمۂ حیات سے ارزانی ہوئی، باغی بنے، نکالے گئے، دوسری بستی بسانے میں ایک ربع صدی کاٹ دی مگر اس مادر علمی کی طرف دل میں کبھی کوئی تلخی محسوس نہیں کی۔ بن باس میں بھی دل اسی میں اٹکا رہا، حالات بدلے، ملک آزاد ہوا، یہاں کا نظام بھی بدلا، ذمّے دارانہ حیثیت سے اس کی خدمت کا موقع میسّر آیا ؛ بُری بھلی جو بن پڑی خدمت کی، اور امید تھی کہ عمر بھر کی سرگشتگی کے بعد سر شوریدہ کو یہیں بالین آسایش نصیب ہو جائے گی، مگر یہ مقدّر نہ تھا، صحت کی خرابی فرائض کی انجام دہی میں مخل ہوتی رہی، بالآخر محبّت ذمّے داری کے احساس نے غلبہ پایا اور میں آپ سے رخصت ہو گیا۔

آج کاسۂ دل، کہ جگہ جگہ سے ٹوٹا ہوا بھی ہے، اس سب پر جو یہاں سے پایا شکر گزاری سے بھرا ہے، اور ان تمام کوتاہیوں پر جو اس دانش گاہ عزیز کی خدمت میں رہ گئیں شرمساری سے بھی چھلک رہا ہے۔ میرے لیے تو اس دانش گاہ سے وابستگی کی یاد ہی زندگی کا بڑا انعام ہے۔ آپ اس پر اس نئے اعزاز کا اضافہ کر رہے ہیں۔

من بہ بوے مست و ساقی پر دہد پیمانہ را

جناب والا ! رسم سی ہے کہ تقسیم اسناد کے جلسے میں جس شخص کو خطبہ دینے کے لیے بلایا جاتا ہے وہ اعلا تعلیم کے کسی مسئلے یا بعض مسائل کے متعلق اپنے خیالات دانش گاہ کے طلبہ اساتذہ اور کارکنوں کے سامنے رکھتا ہے۔ میں چاہتا تھا کہ ایسا نہ کروں، اس لیے کہ جو کہا جاتا ہے وہ محفل آرائی بلکہ وقت گزاری کے سوا بظاہر کسی کام نہیں آتا۔ مگر سوچتا ہوں کہ تکرار ہمیشہ سے تعلیم کا، چاہے افراد کی ہو چاہے جماعتوں کی، خاصا مؤثر ذریعہ رہی ہے، اس لیے عرض کرنے کی جرأت کرتا ہوں۔

سب سے پہلی چیز جو میرے خیال میں آتی ہے وہ یہ ہے کہ ہندستان میں اعلا تعلیم کے ادارے تیزی سے بڑھیں گے اور باوجود اس شور کے جو ہم روز سنتے ہیں کہ ضرورت سے زیادہ لوگ اعلا تعلیم پا رہے ہیں، اور اس لیے بے روزگاری بڑھ رہی ہے، اعلا تعلیم پانے والوں کی تعداد تیزی سے بڑھے گی اور تعداد کو قابو میں رکھ سکنے کی خام خیالی کا نتیجہ بس یہ ہوگا کہ اس بڑھتی تعداد کے لیے اچھی اعلا تعلیم کے صحیح انتظامات سوچ سمجھ کر اور پوری تیاری کے ساتھ نہیں کیے جائیں گے، معیار تعلیم گرے گا ادھ کچرے گریجویٹ جو کسی مرض کی دوا نہ ہوں گے، لاکھوں کی تعداد میں نکلیں گے، بوجھ بجھکڑ فرمائیں گے کہ تعداد کم کرنی چاہیے اور سمجھیں گے کہ بڑی دور کی کوڑی لائے اور تعداد ہو گی کہ بڑھتی جائے گی۔ بوجھ بجھکڑوں کے ذہن نشین اگر یہ ہو جائے کہ ہزار جتن کرنے پر بھی تعداد بڑھے گی تو شاید اس بڑھتی ہوئی تعداد کو اچھی تعلیم دینے کے انتظامات کی طرف زیادہ دھیان دیا جا سکے۔ ابتدائی اور ثانوی تعلیم ملک میں بڑی تیزی سے پھیل رہی ہے اور اس توسیع کی رفتار کو، سچ یہ ہے، اور بھی تیز ہونا چاہیے۔ ہمارے ملک کے دستور میں ہدایت ہے، صاف ہدایت کہ دستور کے نفاذ کے ۱۰ سال کے اندر ہندستان کے سب لڑکوں لڑکیوں کے لیے ۶ سال سے ۱۴ سال تک مفت اور لازمی تعلیم کا انتظام ہو جانا چاہیے۔ ہم نے دیس کی عام ترقی کے دو پنج سالہ منصوبے بنائے اور دوسرے منصوبے میں بڑی دلیری سے اس ہدایت کو پس پشت ڈال دیا ! اور مجھے ڈر ہے کہ دستور کی اس ہدایت پر تیسرے منصوبے میں بھی پورا عمل نہ ہو پائے گا۔ کچھ عجیب سی بات ہے، یہ قومی ترقی کا منصوبہ بنایا جاتا ہے قومی ارادوں کی تکمیل کے لیے، کسی اور معاملے پر قوم نے اپنے ارادے اور اپنی خواہش کا اس صفائی کے ساتھ اظہار نہیں کیا تھا جتنا کہ تعلیم کے معاملے میں۔ ریلوں کی توسیع کے متعلق، صنعتوں کے قیام کے متعلق، زراعت کے متعلق، آب پاشی کے متعلق، کوئی ایسی ہدایت نہیں تھی، تعلیم کے متعلق تھی، وقت کی پابندی کے ساتھ تھی، پھر یہ کہہ دینا کہ وسائل تو محدود ہی ہیں، اگر کسی چیز پر زیادہ خرچ ہوگا تو کسی پر کم کرنا ہی ہوگا اس کھلی ہوئی چوک کو صحیح نہیں بنا دیتا۔ خیر، یہ تو بات میں بات نکل آئی۔ میں کہہ رہا تھا کہ ابتدائی اور ثانوی تعلیم کے پھیلاو کی جو رفتار بھی اس وقت ہے اس سے اعلا تعلیم تک پہنچنے والوں کی تعداد بڑھے گی، پر بڑھے گی۔ اگر آپ چن چن کر خاص قابلیت کے لوگوں کو ہی یونی ورسٹی کالجوں میں داخلہ دیں گے، اور ان کا ٹھیک چناو بھی کچھ کھیل نہیں ہے، تب بھی ان چنے ہوئے لوگوں کی تعداد بھی موجودہ تعداد سے جلد ہی زیادہ ہو جائے گی اور اس وقت جو تعداد ہے اس کے لیے کب ٹھیک اور کافی انتظام ہے۔ کلکتّے کے ایک کالج میں ۱۳ ہزار و دیارتھی تعلیم پاتے ہیں، ہاں، کہتے ہیں کہ تعلیم پاتے ہیں۔ اگر جیسا کہ تجویز ہے کہ کسی کالج میں ۸۰۰ سو سے زائد طلبہ نہ ہوں تو اس ایک کالج کے ساتھ ۱۶ اور کالج بنانے ہوں گے۔ اس مفروضہ پر کہ ثانوی تعلیم جلد ایسی ہو جائے گی کہ اس کے ختم پر لڑکے لڑکیاں اپنے اپنے کام میں لگ جائیں گے اور تھوڑے سے لوگ یونی ورسٹی تک جانا چاہیں گے، اعلا تعلیم کے انتظاموں کو نہ بڑھانا، بڑا دھوکا ہوگا۔ ثانوی تعلیم کی درستی کی کوشش ضرور کرنی چاہیے، جو کوشش ہو رہی ہے وہ میری نظر میں بہت ناکافی ہے، لیکن اس پر غلط بھروسا کر کے اعلا تعلیم کی توسیع کے فرض کو بھلانا بڑی بھول ہوگی۔

یہ تو ہے توسیع کے متعلق میرا خیال۔ لیکن اگر توسیع ارادے سے نہیں ہوئی تیاری کے ساتھ سوچ سمجھ کر نہیں ہوئی تو وہ ایسی من مانی اوٹ پٹانگ شکلیں اختیار کرے گی اور اس تیزی سے اعلا تعلیم کو ایسا کھوکھلا کر دے گی کہ پھر اس کو سنبھالنا مشکل ہوگا۔ یاد رہے کہ اس نامراد منزل تک پہنچنے میں بہت فاصلہ باقی نہیں ہے۔ طالب علموں کی بڑھتی ہوئی تعداد کی نسبت سے استادوں کی تعداد میں اضافہ نہیں ہوا ہے، اچھے استادوں کے درس گاہوں میں لانے کی تدبیریں بھی کچھ بہت کارگر ثابت نہیں ہو رہی ہیں ؛ سامان تعلیم، عمارتوں، کتب خانوں میں اس نسبت سے ترقی نہیں ہوئی ہے ؛ سارے نظام تعلیم میں بیک وقت بڑی بڑی تبدیلیوں کی تجویزوں نے ابھی جڑ نہیں پکڑی ہے، اس لیے بھی خاصی گڑبڑ سی ہے، تعلیم میں انگریزی زبان کی جگہ کے متعلق روز کوئی نیا خیال سامنے آ جاتا ہے، سب ریاستوں کا ایک سا خیال نہیں ہے یونی ورسٹیاں زیادہ انگریزی سے ہی کام لے رہی ہیں، اس نے بھی تعلیم کے معیار کو خاصا گرا دیا ہے۔ اگر اس صورت حال کی درستی کی طرف فوراً دھیان نہ دیا گیا تو یہ بھی کچھ دن بعد سنبھالے نہ سنبھلے گی۔ ہتھیلی پر سرسوں تو زندگی کے اہم شعبوں میں کم ہی کہیں جمتی ہے مگر تعلیم تو خاص طور پر دیر طلب کام ہے۔ اگر کام شروع ہی نہ کیا جائے یا ٹھیک شروع نہ کیا جائے تو مدّت گزرنے پر بھی کچھ نہیں ہونا۔ اسی لیے جلد از جلد کچھ کرنا چاہیے۔ نئے کالج اور یونی ورسٹیاں کھولی جائیں، ان میں اور موجودہ تعلیم گاہوں میں تعلیم پانے والوں اور تعلیم دینے والوں کی تعداد میں ٹھیک نسبت ہو، صرف بڑی بڑی جماعتوں کے سامنے لکچروں سے تعلیم کا کام نہ نکالا جائے بلکہ چھوٹے چھوٹے گروہ ہوں، لکچروں کے ساتھ مذاکرہ Discussion کا طریقہ زیادہ رائج کیا جائے، استاد اور شاگرد میں شخصی تعلق کا امکان پیدا کیا جائے ؛ اور تعلیم کے کام میں اچھے استادوں کو لگانے کے لیے ہر ممکن تدبیر کی جائے۔ امتحان کے طریقے کو بدلا جائے۔ کمیشن امتحان کے رائج طریقے کی مذمت کرتا ہے اور یہ ہے کہ اپنی پرانی چال پر چلا جا رہا ہے، بلکہ تعداد کی زیادتی کی وجہ سے کچھ اور بگڑتا ہی جاتا ہے۔ کوئی سکنڈری اور انٹرمیڈیٹ اگزامینیشن بورڈ دھیان نہیں دیتا، کوئی یونی ورسٹی اپنا امتحان کا طریقہ نہیں بدلتی۔ مجھے خوشی ہے کہ یہاں علی گڑھ میں University Grants Commission کی مدد سے اس پر کام ہو رہا ہے اور مجھے امید ہے کہ اس کام سے ایسے عملی نتائج نکلیں گے کہ یہ یونی ورسٹی اپنے یہاں امتحان کا طریقہ جلد بدل سکے گی اور دوسروں کے لیے کہ سب کسی اگوے کی راہ سی تک رہے ہیں اور نئی ڈگر پر قدم اٹھانے میں ہچکچا رہے ہیں، مثال کا کام دے گی۔ ہے بڑی ذمّے داری کا اور خاصا پیچیدہ کام، مگر ایسے کام بھی کرنے ہی سے ہوتے ہیں، باتیں بنانے سے نہیں بنتے۔

طریقۂ تعلیم اور طریقۂ امتحان میں ضروری تبدیلیوں کے ساتھ ساتھ نصاب تعلیم کا سوال بھی چلا چلا کر اپنی طرف متوجہ کر رہا ہے۔ یونی ورسٹی کمیشن کی سفارش کے مطابق تین سال کی ڈگری کی پڑھائی میں General Education Courses کے جاری کرنے کا مسئلہ اس وقت سامنے ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس مسئلے کے حل کرنے میں تعلیم کی ماہیئت کو سامنے رکھنا ضروری ہے۔ پہلے تو یہ معلوم ہونا چاہیے

اور یاد رکھنا چاہیے کہ منفرد الگ الگ چیزوں سے واقفیت نہ صحیح معنوں میں علم ہے، نہ ذہن کی تربیت کا سامان۔ ذہن کی تربیت کہ ایک معنی میں تعلیم کی مجمل تعریف ہے، ذہن کو مناسب غذا پہنچانے اور اس کو ہضم کرنے، پچانے کی ورزش اور مشق کا موقع فراہم کرنے سے ہو سکتی ہے۔ ذہن کی غذا ہوتی ہے، تمدن کی گوناگوں چیزیں کہ یہ خود ذہن انسانی کی تخلیقات ہوتی ہیں۔ ان میں ذہنِ انسانی اپنی توانائیوں کو محفوظ کر دیتا ہے۔ جب کوئی نیا ذہن انھیں اپنے اندر لیتا ہے، انھیں اپناتا ہے تو یہ توانائیاں پھر سے اُبھر کر اس نئے ذہن کی تربیت کا کام کرتی ہیں، پوری تاثیر کے ساتھ تب ہی، جب بنانے والے ذہن اور اپنانے والے ذہن کی ساختوں میں مناسبت اور مشابہت ہو، لیکن دوسری تمدنی چیزوں سے آشنائی اور تعارف بھی ذہن کی قوتوں کو ابھارتا ہے۔ اور اپنے مناسب حال تمدنی چیزوں سے پوری طرح بہرہ یاب ہونے کی صلاحیت کو اُکساتا ہے۔ ضرورت اس کی ہے کہ تمدنی اشیاء کی اگر موٹی موٹی تقسیم ہو سکے تو ہر قسم کی چیزوں سے ایک بار نشو پذیر ذہن کو دوچار ہونے کا موقع دیا جائے تاکہ وہ ان میں سے اس کا انتخاب بصیرت اور تجربے کی بنا پر کر سکے، جس کے لیے وہ خصوصیت سے موزوں ہے، اور دوسری قسموں سے بھی یک قلم نابلد نہ رہے۔ ان مسائل سے آگاہ ہو جائے جن سے ایک متمدن ملک کی جمہوریت میں سب ہی شہریوں کو سابقہ پڑتا ہے۔ ایک مفکر نے اس پورے میدان کے تین بڑے بڑے حصے کیے ہیں، ان کا ترجمہ نہیں کرتا انگریزی اصطلاحیں بولے دیتا ہوں کہ میری زبان کا دامن تو نہ جانے کتنے چمنوں کے پھولوں سے مالا مال ہے۔ ہاں وہ تین قسمیں ہیں Humanities-Social Sciences-Natural Sciences

اگر یہ ہو سکتا ہے کہ ان تینوں شعبوں سے مناسب واقفیت ثانوی تعلیم کے زمانے میں ہو جاتی۔ ایسی کہ ان کی جدا جدا حیثیت کا واضح احساس ہو جانا تو بہت اچھا تھا۔ ثانوی تعلیم کی نئی تجویزوں میں اس کا لحاظ رکھا بھی گیا ہے، مگر ابھی ایک عرصے تک اس کی امید کرنا غلطی ہوگی کہ یہ واقفیت محض سطحی سے کچھ بھی زیادہ گہری ہو سکے گی۔ شاید اس کے لیے انتظار کرنا ہوگا، ثانوی تعلیم کی مدت میں اضافے کا، یعنی جب ثانوی تعلیم ۱۱ سال کی جگہ ۱۲ سال میں پوری کی جایا کرے گی، میں سمجھتا ہوں کہ ایسا ضرور کرنا پڑے گا، لیکن ابھی تو تدریج جو آدھی بات کو پوری بات پر ہمیشہ ترجیح دیتی ہے ۱۱ سال ہی پر مشکل سے راضی ہو رہی ہے۔ بہرحال ثانوی تعلیم سے اس کام کو پورا کرنے کی توقع ابھی بہت قبل از وقت ہے۔ اس لیے یونی ورسٹی کی پہلی سند کے لیے ان تینوں میں کچھ کچھ دسترس کو لازم کرنے کی تجویزیں ہو رہی ہیں، اور میں دل سے ان کا حامی ہوں۔ ان تینوں میں طرح طرح کے ذہنوں نے اپنی پسندوں، اپنی آرزوؤں، اپنی تمناؤں، اپنی بے تابیوں، اپنی تسکینوں، اپنی جستجوؤں، اپنی دریافتوں، اپنی رمز شناسیوں اور نقاب کشائیوں کی رودادیں محفوظ کر دی ہیں۔ اپنے انداز نظر، اپنے طریقۂ تحقیق کی یادگاریں قائم کر چھوڑی ہیں۔ ان سے نشو پذیر ذہن کو، اپنے مخصوص رجحان کے متلاشی ذہن کو دوچار کرنا، اس کو نشو و نما کے صحیح راستے پر ڈال دینا ہے اور اس کی مناسبت خاص کے پیش نظر اسے اپنے مخصوص میدان فکر و عمل کے انتخاب کا موقع دینا ہے۔ یہ موقع پہلی سند کے بعد تخصیص کی منزل میں اپنا پھل لائے گا۔ اب ہوتا یہ ہے کہ پہلے ہی سے طالب علم کا میدانِ جستجو محدود کر دیا جاتا ہے اور اس کے ابتدائی قدم بھی اس بات کا خیال رکھ کر اُٹھوائے جاتے ہیں کہ اسے اسی میدان کا مرد بننا ہے، اسی میں تخصیص کرنی ہے۔ اور بسا اوقات ہوتا یہ ہے کہ وہ تخصیص کی منزل تک پہنچتا ہی نہیں۔ اس کے سب ابتدائی قدم اس منزل کی تیاری بن کر رہ جاتے ہیں جو مقصود ہی نہ تھی۔ یہ قدم اکثر و بیشتر منفرد واقفیت پر مشتمل ہوتے ہیں؛ مضمون کے مرکزی تصورات اور بنیادی خیالات کا ذکر تک نہیں آنے پاتا؛ مسافر درخت پر درخت دیکھتا ہے اور جنگل نظر سے اوجھل ہی رہتا ہے۔ تخصیص کے فوائد سے بھی محروم رہتا ہے اور تمدنی زندگی کے بنیادی افکار اور رجحانات سے بھی محض ناآشنا۔ اپنے نصابوں پر نظر ڈالیے اور دیکھیے کہ ان میں جماعتی اور سیاسی بصیرت کی نشو و نما کا، انسان کی تخلیقی کاوشوں، ادب، موسیقی، آرٹ سے لطف اندوز اور بہرہ یاب ہوتے سکا، کائنات قدرت اور عالم انسانی پر مفکرانہ نظر ڈال سکنے کا امکان کہاں ہے اور کتنا ہے؟ بس ایک محدود حلقہ کی بہت سی چیزوں کے نام اور صفتیں طالب علم کو یاد ہیں، خود اُن کے روابط بھی نگاہ سے چھپے ہوئے ہیں۔ زندگی جن جاندار خیالات سے متاثر ہے یہ ان سے ناآشنا ہے۔ اپنے سماجی اور طبیعی ماحول کے سمجھنے سے قاصر ہے۔ اپنی جماعتی اور سیاسی ذمے داریوں کا بوجھ اٹھا سکنے کے لیے یک سر نااہل ہے، شعر کے لطف سے محروم، موسیقی کے لیے اس کے کان بہرے، نقش و رنگ کی کرشمہ سازیوں کے لیے اس کی آنکھیں اندھی۔ تخصیص کرنے والا تو اپنی تخصیص سے کچھ فائدہ بھی اٹھاتا ہے، اگرچہ وہ بھی اپنی دنیا تنگ کر کے یہ فائدہ بہت منہگے داموں خریدتا ہے، مگر یہ غریب پہلی سند والا تو اس تنگ دامانی کے باعث نہ گھر کا رہتا ہے نہ گھاٹ کا۔ اس صورتِ حال کو بدلنا ضروری ہے اور سب پہلی سند والوں کے لیے علمی، ادبی، جمالیاتی اور اخلاقی اقدار سے تعارف کا اہتمام لازم۔ تجویز یہ ہے کہ سب کے لیے Humanities, Natural Sciences, Social Sciences اور زبان کی تعلیم کا انتظام کیا جائے: پہلی سند کے بعد جو چاہے جس میدان میں تخصیص کرے۔ یہ نیا تجربہ ضرور کرنا چاہیے۔ لیکن اگر یہ بغیر خوب سوچے سمجھے اور بغیر پوری تیاری کے کیا گیا تو مجھے ڈر ہے کہ ایک سطحی تبدیلی سے زیادہ ثابت نہیں ہوگا اور رواج عام کے خلاف ہونے کی وجہ سے بہت جلد اس کی ناکامی کا اعلان ہو جائے گا اور یارانِ سست گام، کہ ان کی تعداد ہماری اعلا تعلیم کے مرکزوں میں کچھ کم نہیں، فاتحانہ چلا اٹھیں گے، دیکھیے ہم نہ کہتے تھے! اس نئے نصاب کے بنانے میں یاد رکھنا ہوگا کہ اس وقت کے نصاب کی طرح صرف منفرد معلومات مقصود نہیں اس لیے کہ اگر ہر شعبے میں اسی حساب سے منفرد معلومات کا بوجھ یکجا کر دیا گیا تو طالب علم غریب اسے اٹھا کیسے سکے گا۔ ضرورت ہوگی بڑے کڑے انتخاب کی، صرف بنیادی تصورات کو پیش کرنا ہوگا، خبر کی بھرمار نہ ہوگی، نظر پیدا کرنے کی کوشش ہوگی۔ مجھے امید ہے کہ اس میدان میں بھی یہ یونی ورسٹی اپنے اساتذہ کے غور و فکر اور محنت سے ایسی تیاری کرے گی کہ اس کے کام کو اعلا تعلیم کے حلقوں میں ایک امتیازی شان حاصل ہو سکے گی۔

جناب والا! جن ضرورتوں اور تجویزوں کا ذکر اوپر کر چکا ہوں ان سب سے یونی ورسٹی کے مصارف بڑھیں گے، سرکاری امداد پر دن بہ دن زیادہ انحصار ہوتا جائے گا۔ اسی یونی ورسٹی کا نہیں، ملک میں تمام اعلا تعلیم کے مرکزوں کا۔ پھر سائنس اور صنعت، طب اور زراعت، کی تعلیم میں بے دریغ روپیا صرف کرنا ہوتا ہے، ملک کو اس کی شدید ضرورت بھی ہے، یہ روپیا بھی سرکار ہی دے گی۔ آپ نے جیسے میڈیکل کالج کے لیے کوئی ۶۰ لاکھ روپیا غیر سرکاری طور پر اکٹھا کر لیا تو سب یونی ورسٹیاں نہیں کر سکیں گی۔ غرض ملک میں اعلا تعلیم کے ادارے اپنے کام کی اصلاح اور توسیع کے لیے روز بروز حکومت سے زیادہ وابستہ ہو جائیں گے۔ حکومت تعلیم پر فیاضی سے روپیا صرف کرنے کی نیت بھی رکھتی ہے۔ یہ سب کچھ بہت اچھا ہے، مگر دل میں ایک وسوسہ ضرور پیدا ہوتا ہے کہ اعلا تعلیم کی آزادی کہیں خطرے میں نہ پڑ جائے۔ آزادی سے پہلے انگریزوں کے راج میں ہماری اعلا تعلیم کے ادارے بالکل غیر ملکی سیاست میں کسے ہوئے تھے، یہی وجہ تھی کہ انھیں قومی زندگی میں وہ تنویری اور تخلیقی مرتبہ حاصل نہیں تھا جو اُن کا منصب ہونا چاہیے۔ آزاد ہندستان میں یہ تعلیم گاہیں اگر قومی زندگی کی نشو و نما میں، اس کے نکھار اور سدھار میں، اپنا فرض اس طرح انجام دینا چاہیں گی جیسا کہ ان کا حق ہے تو انھیں اپنے کام میں آزادی درکار ہوگی۔ دانش گاہیں ذہنی اور اخلاقی زندگی کا مرکز ہوتی ہیں اور ذہنی اور اخلاقی زندگی آزادی ہی میں پھلتی پھولتی ہے، نہیں، آزادی اس کے لیے شرطِ حیات ہے۔ آزادی کے بغیر کوئی دانش گاہ نہ تمدنی سرمایہ کو نئی نسلوں تک صحیح طور پر پہنچانے کا کام کر سکتی ہے نہ اس کی صحت مند تنقید و تطہیر کا؛ نہ جہالت اور توہمات اور تعصبات کے لشکروں کو پسپا کر کے علم و دانش، اخلاق حسنہ اور حیات صالحہ کے گڑھ سر کر سکتی ہے۔ نہ اچھی سیرت و تعمیر کا کام کر سکتی ہے نہ اسے شخصیت کے مقام بلند تک پہنچانے کا۔ مبارک اور خوش نصیب ہے وہ قوم جس کی حکومت اعلا تعلیم کے اس گُر کو سمجھ لیتی ہے، اپنی دانش گاہوں کو بے دریغ

وسائل فراہم کرنے میں کوتاہی نہیں کرتی اور ان کی آزادی میں ایک لمحے کے لیے مخل نہیں ہونا چاہتی۔ یہ حکومت کی صحت افدار کی کسوٹی ہے، مجھے یقین ہے کہ ہماری آزاد حکومت اس امتحان میں پوری اُترتی رہے گی۔

لیکن، جناب محترم! ہمیں جو دانش گاہوں سے وابستہ ہیں یہ بات کبھی نہ بھولنی چاہیے کہ یہ آزادی بھی ہر دوسری آزادی کی طرح اپنے اوپر آزادی سے پابندیاں لگاتی ہے۔ صحیح آزادی کہتے ہی ہیں خوشی سے اپنے اوپر ضروری پابندیاں لگانے کو۔ بے راہ روی، من مانے تلوّن کو آزادی نہیں سمجھتے۔ تلاشِ حق اور تبلیغِ حق میں آزادی کے حق کے ساتھ دانش گاہوں پر سماجی ذمّے داریوں کو بخوشی اٹھانے کا فرض بھی عائد ہوتا ہے۔ ہندستان کی دانش گاہوں کی سماجی ذمّے داری بہت بھاری ہے۔ مُلک صدیوں کی غلامی سے آزاد ہوا ہے۔ غلامی، ذہن اور روح کا بڑا مہلک روگ ہوتی ہے۔ غلام، ذمّے داری کے تصوّر سے عاری ہوتا ہے اور اخلاق کے تصوّر سے بے نصیب، آزادی میں قدم رکھتے ہی اپنے ہر فعل کے حسن و قبح کا بوجھ اس کے سر آپڑتا ہے۔ اخلاق کی پابندیاں اپنے سر لے کر ہی اس کو سچی آزادی نصیب ہوتی ہے۔ غلامی سے آزادی میں یہ سفر بڑا دشوار گزار سفر ہوتا ہے۔

ذہن اور روح کی قوّتوں کو بے دار کرنا ہوتا ہے، پرُانی عادت بار بار قدموں میں لغزش پیدا کرتی ہے، اقدارِ صالحہ کے سہارے ہی سے ان قدموں کو قوّت ملتی ہے، رہروؤں کو ثابت قدمی نصیب ہوتی ہے۔ کبھی کبھی تو یہ نووارد اس نئی آزاد دنیا میں اجنبی اجنبی سے لگنے لگتے ہیں۔ ان کے ذہنوں کو اقدار کے معاملے میں صاف کرنا، ان کے جذبات کو فلاحِ قومی کے ساتھ وابستہ کرنا، انھیں خود غرضی اور نفس پروری کی تنگ و تاریک گھاٹیوں سے نکال کر مفادِ جماعتی کی روشن وسعتوں کا خوگر بنانا، فرقہ وارانہ وفاداریوں کو نکھار کر انھیں وحدتِ قومی کا دل دادہ بنانا، ان کی تن آسانیوں کو مفید جماعت مشقّت میں بدلنا، غرض قومی مزاج کو آزادی کے مطالبوں کے مطابق بنانے کا کام بڑی حد تک دانش گاہوں کا کام ہے۔ یہ کام چونکہ آزادی ہی میں ہو سکتا ہے اس لیے ہر دانش مند، آزادی دوست، جمہوری حکومت، دانش گاہوں کی آزادی میں خلل انداز ہونے سے باز رہے گی۔ مگر دانش گاہوں کو بھی یہ مہتم بالشان کام انجام دے کر اپنے کو اس آزادی کا مستحق ثابت کرنا ہوگا۔ اس وابستگی کی بنا پر جو مجھے اس دانش گاہ سے آرہی ہے اور رہے، جی چاہتا ہے کہ کاش یہ اس میدان میں اوروں سے آگے رہتی اور مجھے ایسا لگتا ہے کہ اسے اوروں سے کسی طرح کم نہیں بلکہ کچھ زیادہ ہی اس کا موقع ہے کہ یہ آزاد ہندستان کی ذہنی اور روحانی قیادت میں اوروں سے آگے رہے۔ میری دانست میں کسی ہندی دانش گاہ کے طلبہ میں ہندو، مسلم، سکھ، عیسائی کی ایسی اور اس نسبت میں آمیزش نہیں ہے جتنی کہ یہاں ہے۔ اس کے اساتذہ میں بھی یہ تنوّع جس طرح جلوہ گر ہے دوسری جگہ کم ہے، اس کی اقامتی زندگی کی روایتیں اسے ایک مثالی علمی بستی بنانے میں سازگار ہیں۔ آزادی کے بعد بڑی مایوسی کے دور سے گزر کر خود اعتمادی حاصل کی ہے اور نئے آزاد سماج کے تجربے نے اس کے ساتھ ایک تازہ اور شاداب تعلق خاطر پیدا کیا ہے۔ اس سے یہ توقع کسی طرح بے جا نہیں کہ یہ صالح انفرادی اور اجتماعی زندگی، ذمّے دار شہریت، بے لاگ تحقیق، نڈر تنقید، بے لوث خدمت، بے باک صداقت، مخلصانہ تعاونِ باہمی، ادب، تمیز، سلیقہ اور سب سے زیادہ وحدتِ قومی کے تصوّر میں سرشاری کی خصوصیتوں سے ممتاز، ایک تعلیمی بستی بن جائے گی جس پر ہمارا وطن ناز کر سکے گا۔ مبارک ہے وہ دانش گاہ جس کے طلبہ، اساتذہ اور کارکنوں کی مشترک کوشش ہے کہ بغیر سب کی کوشش یہ کام ہونے والا نہیں، یہ منصوبہ بہ روے کار آسکے۔

نوجوان دوستو! تم جو آج سندیں لے کر عرفِ عام میں زندگی میں قدم رکھ رہے ہو تم سے بھی کچھ کہنا چاہیے۔ کیا کہوں؟ الکشن کا موسم ہے اگر سیاست کے میدان میں انتخاب کا امیدوار ہوتا تو میرا کام آسان ہوتا۔ تمھاری تعریف کرتا، مبالغہ کے ساتھ تعریف، خوشامد کا جادو بڑے بڑے گھاگھوں پر چل جاتا ہے، تم ایسے کہاں کے دانا ہو کہ اس سے متاثر نہ ہوتے، تم خوش ہو جاتے، مجھے ووٹ مل جاتے۔ کہہ سکتا تھا کہ تمھارے ہاتھوں میں قوم کا مستقبل محفوظ ہے، اجی نہیں دنیا کا مستقبل۔ تم ہمارے مستقبل کی امید ہو، اس کی درخشانی کا وعدہ ہو۔ مگر کیا کروں اور کیسے یہ نہ سوچوں کہ تم سے پہلے اور لوگ بھی اس دیس میں نوجوان رہ چکے ہیں وہ بھی تو امید تھے، وہ بھی تو ایک وعدہ تھے، پر وہ وعدہ جو وفا نہیں ہوا، وہ امید جو بر نہیں آئی۔ اگر تم امید ہو اور وعدہ تو اس کا پورا ہونا تھا تمھاری کوشش، ساری زندگی کی پیہم کوشش پر منحصر ہے۔ اس پر منحصر ہے کہ تم سمجھ لو کہ زندگی خاصی گمبھیر چیز ہے، خالی لفظوں سے باتوں سے اس کی ساخت نہیں ہوتی۔ یہ خالی فقرے بازی نہیں، محض شخصی نفع نقصان کا کھاتا نہیں، خود بینی اور خود پروری نہیں، خالی آرام و آسایش کی تلاش نہیں، اچھی سی تنخواہ اور بالائی یافت کا نام نہیں، کہ بس بی، اے کیا، نوکر ہوئے، پنشن ملی اور مر گئے۔ جس دُھرے پر زندگی گردش کرتی ہے وہ سود و زیاں، آرام و تکلیف، حظ و کرب کا دُھرا نہیں۔ وہ دھرا ہے خوب و زشت، اعلا و ادنا کا، ترقی اور انحطاط کا۔ بڑی کٹھن چیز ہے زندگی، پر بڑی دلکش چیز بھی ہے یہ اعلا کو جان کر ادنا پر راضی ہونے کو معصیت جانتی ہے اور خوب سے خوب تر کی طرف بڑھے جانے کی پیہم سعی کا نام ہے۔ زندگی ایک مشن ہے، زندگی خدمت ہے، زندگی عبادت ہے۔ اس خدمت کو انجام دینے، اس مشن کو پورا کرنے، اس عبادت کا حق ادا کرنے کے لیے تمھیں ڈھونڈ ڈھونڈ کر اپنی فطری صلاحیتوں کا پتا چلانا ہوگا، اور ان میں ہم آہنگی اور توازن پیدا کرنا ہوگا۔ بے لاگ فکر کی آنچ میں تپا تپا کر اور مخلصانہ عمل کے ہتوڑے سے اسے کوٹ کوٹ کر اپنی زندگی کے مسالے کو استواری اور پائے داری بخشنی ہوگی۔ ارادے کی قوّت کو مشق سے مضبوط کرنا ہوگا اور قابو میں لینا ہوگا تاکہ وہ بس کبھی کبھی ایک طغیانی عمل کی صورت میں اپنے کو ظاہر نہ کیا کرے بلکہ ایسا معتبر منبع ہو کہ اس سے ایک مدّت تک توانائی حاصل کی جاتی رہے اور ان کاموں میں اس کو لگایا جا سکے جو واقعی کرنے کے کام ہیں اور جن کی ماہیت میں اکثر یہ ہوتا ہے کہ اپنی تکمیل کے لیے ایک زمانہ چاہتے ہیں۔ اپنی عقل اور سمجھ کی برابر تربیت کرنی ہوگی تاکہ ہمیشہ دوسروں ہی کا منہ نہ تکو خود فیصلے کر سکو خصوصًا ایسے فیصلے جو تم ہی اپنے لیے کر سکتے ہو اور جن سے کوئی مفر نہیں ہوتا؛ تمھیں اپنی نظر کو برابر وسعت دینے کی مشق کرنی ہوگی تاکہ دوسروں کا نقطۂ نظر بھی سمجھ سکو اور اس کے ردو قبول سے پہلے اسے بے تعصبی سے جانچ۔ تمھیں اپنی زندگی کے تنگ شخصی دائرے کو وسیع کر کے اسے دوسری زندگیوں سے ملانا ہوگا؛ اپنی ہمدردیوں کو عام کرنا ہوگا، جماعتی ذمّے داری کا بوجھ خوشی خوشی اٹھانا ہوگا؛ شخصی مفاد اور اپنے چھوٹے گروہ کے اغراض کو وسیع تر اور اعلا تر اغراض کا تابع بنانا سیکھنا ہوگا؛ اپنے کام اور اپنے ماحول پر کبھی کبھی بے گانہ وار ناقدانہ نظر کرنے کی عادت ڈالنی ہوگی؛ جماعتی اور عمومی مسائل کو سائنٹفک تنقیدی نگاہ سے دیکھنے کا اپنے کو خوگر بنانا ہوگا؛ اپنے شخصی جماعتی تعصّبات پر کڑی نگرانی رکھنی ہوگی اور ہر طرح کے پروپیگنڈا کی فریب کاریوں سے اپنے فکر و فہم کو محفوظ رکھنے کے جتن کرنے ہوں گے۔ اپنی زندگی میں یہ صفتیں پیدا کرنے کے ساتھ ساتھ، ساتھ ساتھ اس لیے کہ یہ کام کبھی نہ ختم ہونے والا کام ہے، اس کو ختم تک پہنچا کر جو لوگ زندگی کو کام میں لگانا چاہتے ہیں، انھیں پھر زندگی کی مہلت نہیں ملتی، ہاں، تو اُن کو پیدا کرنے کی کوشش کے ساتھ ہی ساتھ اپنے کو کسی قدرِ اعلا کا خادم بنا لینا کہ اسی سے آنی و فانی زندگی میں ثباتِ دوام کا رنگ آتا ہے، اور بے معنی جیے جانا بامعنی زندگی بن جاتا ہے۔ تمھارا راستہ تمھاری فطری انفرادیت سے شروع ہوتا ہے، اپنی انفرادی صلاحیتوں کی ہمہ جہتی نشوونما کر کے اور ان میں ہم آہنگی پیدا کر کے مستقل سیرت کے مقام سے گزرنا ہے اور جب یہ سیرت کسی اعلا قدرِ مطلق کی خدمت گزار بن جاتی ہے تو یہی راستہ شخصیتِ اخلاقی کی منزل تک پہنچا دیتا ہے۔ بہت دشوار گزار ہے، مگر انسانی زندگی کے شایانِ شان راستہ یہی ہے اور باوجود اپنی صعوبتوں کے بڑا ہی دلکش ہے یہ راستہ۔ اس پر چلنے کے لیے کمر کس لو میرے نوجوان دوستو۔ مسافروں کا نگہبان اور راہ گیروں کا رکھوالا تمھارے سفر کو برکتوں سے بھر دے۔

سرسید کا تصور اسلام

ہم علیگڑھ والے آدھے آدھے بٹے ہوئے ہیں۔ آدھے، سرسید کی تفسیر قرآن کو پسند کرتے ہیں۔ اور اس کے قائل ہیں کہ اگر یہ تفسیر نہ لکھی گئی ہوتی، تو اسلامیانِ ہند اندھیرے میں رہتے۔ (اور اس کے قائل ہیں کہ اسلام سارے زمانوں کے لئے آیا ہے، اور اس کے پاس سارے زمانوں کے چیلینجوں (challenges) اور سوالوں کا جواب دینے کی سکت ہے، اور ہر زمانے بلکہ ہر زمین کے رہنے والوں کے لئے اسلام کے پاس ہر پرابلم کا حل ہے، وہ کوئی بھی زمانہ کوئی بھی زمین ہو۔

سرسید بہت اچھی شاعری بھی کر لیتے تھے؛ فارسی میں! اتنی اچھی نعت اور اتنی اچھی حمد لکھ کر سرسید نے اللہ اور اس کے بندوں کے دلوں میں ایسی جگہ بنائی ہے کہ لگتا ہے وہ دل سے شاعر تھے۔

بنیادی باتوں میں وہ ہمارے آپ کے مانند توحید پرست تھے کہ اللہ ایک ہے، رسول کریم کو آخری پیغمبر مانتے تھے اور قرآن مجید کو ہدایت کی آخری کتاب۔ آخرت کو مانتے تھے کہ اچھے عمل کا اچھا بدلہ ملے گا اور برے عمل کا برا۔ اور اس کے لئے عمل صالح کو اسلام کا اٹوٹ جزو مانتے کہ اچھا عمل ہی نہ ہو گا تو

ع زباں سے کہہ بھی دیا لاالہ تو کیا حاصل!

قول اور عمل میں کوئی تضاد/فرق نہ ہونا چاہیے۔ اور عمل، ایسا عمل صالح ہو کہ جیسے لوگ آج کل کئی سماجی موقعوں پر بے ساختہ کہہ بیٹھتے ہیں، "اماں تم تو بالکل انگریز معلوم ہوتے ہو"، بس ایسے ہی اپنے ہر بیوہار میں دنیا کے ہر کام میں جہاں کوئی دوسرا یا تیسرا بندہ involved ہو، دس بیس تیس کی بات ہو، ارد گرد پھیلے مسلمانوں میں، انسانوں کی بات ہو، اور ان سے کوئی معاملہ آپڑے تو بے ساختہ تعریف یا تعریض میں زبان سے نکل جائے، "اماں تم تو بڑے مسلمان لگتے ہو!" وہ بات کرے، کوئی کام کرے، آئے جائے، ہنسے بولے، تو اس کی گفتگو میں یا اس کے عمل میں ذرہ برابر بھی کوئی نازیبا بات نہ پائی جائے۔ وہ وعدہ کرے تو پورا کرنا ہی کرنا ہے۔ وہ کوئی بات کرے تو بس سچ ہی سچ ہو۔ سچ اور سچ کے سوا کچھ بھی نہ ہو۔ اور لوگ مثال دینے لگیں کہ مسلمان ہو کے بھلا کوئی جھوٹ بول سکتا ہے۔ دنیا کی ہر پرابلم (problem) حل کرنے کے لئے لوگ اس کے پاس آئیں۔ اور جس محلے، بستی، شہر میں، ملک میں ہو، پورا ارد گرد، پورا ماحول امن چین سکون اطمینان کی سانس لیتا رہے، کہ پوری بستی کا رہنا سہنا کھانا پینا، اس کی ذمہ داری ہو، اس لئے کہ چالیس گھر تک دائیں اور چالیس گھر تک بائیں، چالیس گھر تک آگے اور چالیس گھر تک پیچھے، اس رات کوئی بے کھائے پیے سو گیا تو خود اس کا اپنا کھانا پینا تو حلال ہی نہیں ہوا، حرام اس لئے ہو گیا کہ اس نے دنیا کے سب سے بڑے آدمی کو، اپنے رسول کو، یہ کہتے ہوئے سنا تھا، اور اس کی بات ہم تک پہنچ گئی تھی کہ پڑوسی بھوکا سو گیا تو آپ کو میسر شدہ لقمہ حرام ہے۔

سرسید ان سب باتوں پر ایمان رکھتے تھے اور اسی لئے سب سے پہلے روزی روٹی کے لئے انتظام کرتے تھے، اور اپنی قوم کو تعلیم یافتہ قوم بنانے کی کوشش کرتے تھے۔

ایک خدا، ایک رسول، ایک بدلے کا دن، ایک انسانیت، ایک امن چین اور سکون، بس ساری عمر اسی کے لئے جیتے رہے۔ اسلام ان کے لئے سب سے اچھا مذہب تھا، جیسے ہندو بھائی کے لئے ہندو مذہب، عیسائی/مسیحی بھائی کے لئے مسیحی مذہب۔ مندر میں جائے، مسجد میں جائے، اپنے خدا سے مل کے واپس سماج میں آکے کاروبار کرے، نوکری کرے، دکانداری کرے، محنت مزدوری کرے، پورا دن نہ وہ رام لال تھا، نہ احمد علی، نہ رابرٹ۔ کھانا پینا، دنیا کا کاروبار کرنا، ایک سے ہاتھ پیر، ناک آنکھ کان، جیسے سب پرندے چرندے اللہ کی مخلوق، ویسے ہی ہم انسان اللہ کی مخلوق! تو اس کے لئے ہر وقت بے چین رہنا کہ کوئی پڑوسی بھوکا نہ رہ جائے۔ پڑھنا لکھنا سکھانا ہی سکھانا ہے۔ پھر اپنے اپنے کام سنبھالو۔ اپنے کلچرڈ (مہذب) شہری ہونے کے فرائض کو مہذب طریقے سے انجام دیتے رہو۔ بس یہی سید کی دین تھی، اور یہی علی گڑھ کا پیغام تھا، اور ہے۔

سید ہم لوگوں میں آدھے آدھے بٹے ہوئے تھے/ہیں۔ آدھے وہ جو ان کی اصلاحی کوششوں اور ان کی قرآنی خدمات کا کوئی ذکر نہیں کرتے، جنہوں نے انگلستان جاکر بھی میور (Muer) اور ڈیوین پورٹ (Davenport) اور ہگنس (Higgins) کو یاد رکھا، اور میور کے اعتراضات کا ان ہی زبان انگریزی میں جواب دیا۔ اور ڈیون پورٹ اور ہگنس جیسے انصاف پسند عیسائیوں کی کتابیں اپنے خرچ سے چھپوائیں، پہلی اصل انگریزی میں اور دوسری اردو ترجمے میں۔

حالی کی حیات جاوید میں پادریوں کے خلاف سرسید کا خط پڑھیے کیسا دل جلا کے سرکار کو لکھا ہے، اور سب کچھ لکھ دیا ہے جس سے سرکار مطلق خوش نہ ہوئی ہو گی۔ مگر سید کو تو ان پادریوں کے خلاف لکھنا ہی تھا، جو مسلمانوں کو اور دوسرے ہندستانیوں کو اپنے اپنے مذہب سے چھڑا کے مسیحیت میں لانا چاہتے تھے: عیسائیوں کے لئے عیسائیت، مسلمانوں کے لئے اسلام، ہندو بھائیوں کے لئے ہندو مت: جھگڑا کاہے کا۔

(ڈائری کا ایک ورق، ۱۱ دسمبر ۲۰۲۲ء)

☆☆☆

پُراسراریت

ع ہاتھ آئے تو بت، ہاتھ نہ آئے تو خدا ہے۔

سب سے بڑی مسٹری (Mystery) یا پر اسراریت تو یہی مصرعے کا موصوف ہے۔ پھر امجد حیدر آبادی کے اس معرکہ آرا مصرع کے جلو میں 'خدا' پر محسن صاحب کی نظم یاد آئی (اب یہ کہاں ملے گی؟)، وامق جونپوری کی نظم یاد آئی: ''یہی شاید ہے خدا''۔ بات وہی ہے جو ہمارے کسی قدیم دانشور شاعر نے کہہ دی تھی:

تھک تھک کے ہر مقام پر دو چار رہ گئے
تیرا پتہ نہ پائیں تو ناچار کیا کریں

اور سب سے زیادہ مزے سے تو اس شعر کے ایک متنازعہ مالک نے کہی تھی۔ مالک دو بتائے گئے جاتے ہیں:

پہلے تو بھائی منیر فرشوری تین برس تک کچھ شک و شبہ کے ساتھ کہتے رہے کہ شعر بدایوں کے قمر الدین فرشوری صاحب مرحوم کا ہے۔ مگر پچھلے مہینہ انھوں نے ڈکلیئر کر دیا کہ یہ اکبر الہ آبادی کا شعر ہے۔ شعر یہ ہے:

تو دل میں تو آتا ہے، سمجھ میں نہیں آتا
میں جان گیا بس تیری پہچان یہی ہے

بات پر اسراریت کی ہو رہی تھی۔ سوچو تو دنیا سچ مچ مایا کے سوا کچھ بھی نہیں، اور نہ سوچو تو (بلکہ سوچنے کا وقت ہی کہاں ملتا ہے)، دنیا ایسے گھیرے رہتی ہے: صبح سے شام تک کہ اپنے اپنے دھندوں میں یا دھن میں ہمیں الجھائے رکھتی ہے (اور پھر ''ڈور کو سلجھا رہا ہوں اور سرا ملتا نہیں'') اور اس لئے آخر میں عافیت اسی میں نظر آتی ہے کہ ''غرق مئے ناب اولیٰ'' سمجھنا سمجھانا اپنے بس کا ہے ہی نہیں، تو مغز پچی کیوں کی جائے۔

●

ہمیں تو ادب نے لپیٹ رکھا ہے، اس لئے سامنے کی عجیب عجیب بلکہ دلچسپ باتیں، سامنے آتی جاتی ہیں۔

اب یہ کیا ہے کہ سب سے اونچی سطح پر ''گہے بر طارم اعلی نشینم'' تو انیسویں صدی سے شروع کریں تو طارم اعلیٰ پہ دو چوٹی کے لکھنے والے، چوٹی کے دانشور، دو دو:

ہر عہد میں: سرسید کے بعد سے دیکھنا شروع کریں تو شبلی اور حالی۔ آگے چلیں، تنقید ہی کی لائن میں لے لیں، تو ''طارم اعلیٰ'' پر احتشام صاحب اور سرور صاحب۔

اگلی پیڑھی میں شمس الرحمن اور نارنگ۔ اب ادھر ادھر بکھر نامت شروع کیجئے کہ وہ دو کی گنتی ہوئی تو پھر عہد سرور میں کلیم الدین احمد بھی تو تھے (مگر ہم اپنا دو والا حساب ابھی سمیٹے رکھتے ہیں، ورنہ جھگڑا شروع ہو جائے گا) کیوں کہ آگے بڑھیں تو شبلی والے زمانے میں محمد حسین آزاد بھی تھے۔ اپنی طرف پلٹ آجائیں تو شمس الرحمن والے عہد میں غیر معمولی ذہانت رکھنے والے وارث علوی اور شمیم حنفی بھی تھے۔ مگر بحثا بحثی میں وہ اصل نکتہ جو پر اسراریت کے ساتھ لپٹا ہوا پہلی نظر ہی میں سامنے آجاتا ہے، وہ اپنی جگہ رہا۔ ورنہ دروازے کھولتے جائیں تو ''ہزار ہا شجر ہائے سایہ دار راہ میں ہے''، پھر ہم ایک اور مصرع بھی کیوں نہ لکھ دیں:

ع سمٹے تو دلِ عاشق پھیلے تو زمانہ ہے

یوں، اب سمٹنے کے لئے رہا بھی کیا ہے!

شمس الرحمن اور نارنگ کے بعد،

کسی کو دغدغۂ حشر ہے، کسی کو فکر معیشت۔ ادب بے چارے کو نہ یہاں کوئی پوچھے ہے، نہ وہاں۔

روتے دھوتے پڑوسیوں کا ادب آجاتا ہے، تو وہاں بھی دو کی پُراسرایت: احمد ندیم اور فیض کے سوا ''رکھا ہی کیا ہے آخر''۔

جیسے خود ہمارے یہاں آخری بازی مارنے والے اتنے ہی دیو قامت، ایسے ہی دو بڑے، جذبی اور خورشید الاسلام! اب ادھر ادھر گھوم پھر کے، نہ کہیے کہ: تھے تو اسی عہد میں میکش اکبر آبادی بھی: معاصر شاعری میں کیا اس شعر کا کوئی جواب ہے!

یہ کائناتِ زمان و مکاں سفر ہی سفر
نہ عاشقی میری منزل نہ حسن ترا مقام

●

ذاکر صاحب کا ۱۹۵۷ء میں علی گڑھ کا دیا ہوا کونووکیشن ایڈریس جنھوں نے سنا ہوگا (یا پڑھا ہوگا) اور سننے والوں پر اہتزاز کا وہ عالم گزرا ہوگا۔ جو کبھی کسی پر شاید ہی گزرا ہو۔ اور پھر جنھوں نے علی گڑھ تحریک پر سید حامد کا خطبہ (خدا بخش خطبہ) سنا ہوگا تو دونوں جگہ وہ پر اسراریت چھائی ہوئی لگے گی۔ کہ علی گڑھ کا برسوں پہلے کا طالب علم، برسوں بعد علی گڑھ کا سربراہ بن کے آئے۔ اور ایسے پیار سے اسے سنوارے، بنائے۔ اب یہ کچھ نہ کچھ پر اسراریت تو ہوئی: نام بدل گئے، ایک بار ذاکر حسین، دوسری بار سید حامد۔

(۱۷ جنوری ۲۰۲۳ء)

***

- آخر کو ہمارے مرشد نے یہ بھی تو سکھایا ہی تھا کہ اختلاف ضرور کر سکتے ہو، اختلاف ہر سوچنے والے کا حق ہے۔ مگر مخالفت نہیں، یہ شرافت سے بعید ہے۔ (اقتباس)
- دو تین لکھنے والے جنھیں پڑھنا اچھا لگتا ہے، ایک حسن کمال (انقلاب میں)، ایک تولین سنگھ (انڈین اکسپریس میں)، ایک فیضان مصطفیٰ (انڈین اکسپرین میں)، اور ایک اپوروانند (انڈین اکسپریس میں)۔

ہندستانی بھاشا

گاندھی جی کہتے تھے ہندستان کی زبان ہندستانی ہونا چاہیے، اور کہنا چاہیے۔ آخر فرانس کی زبان فرنچ کہلاتی ہے، انگلستان کی انگریزی، جرمن کی زبان جرمن کہلاتی ہے۔ تو ہندستانی زبان کیا کہلائے گی: ہندستانی جو دونوں لپیء، اردو اور ہندی میں لکھی جاتی ہے۔

یہ منزل سر کرنے کے لئے آخری بڑی کوشش قاضی عبدالودود کے مکان پر بپا ہوئی۔ ڈاکٹر ذاکر حسین، پروفیسر مجیب، مولوی عبدالحق، خواجہ غلام السیدین، قاضی عبدالودود (اور ایک دو اور نام یاد نہیں آرہے ہیں)۔ شاید ڈاکٹر سید محمود بھی تھے۔ گاندھی جی کسی ضروری کام میں پھنس گئے تھے، اس لئے اپنے ''سفیر'' ڈاکٹر راجندر پرشاد کو تار دیا کہ اس محفل میں بطور میرے نمائندے کے شریک ہونا ہے۔

اس محفل میں طے ہوا کہ **فرہنگ آصفیہ** کے وہ سارے الفاظ جو ہندی میں پرچلت ہیں، اور ہندی **شبد ساگر** کے سارے وہ ہندی الفاظ جو اردو میں پرچلت ہیں، ان سب کو جمع کیا جائے، وہ ہندستانی کی پہلی ڈکشنری ہوگی۔ اس کے بعد اسی کام کو آگے بڑھایا جائے تو ہندوستانی کی یہ ڈکشنری دوگنی تو ہو ہی جائے گی۔ اس پر سب متفق ہو گئے تھے۔ پھر خدا جانے کیا ہوا۔

اس محفل کی پوری کاروائی اس زمانے کے مولوی عبدالحق کے پرچے میں محفوظ ہے۔

جیسے بہار کی ریاست آدھی مسلمان ہوگئی، شراب بندی کا قانون نافذ کرکے۔ ایسے ہی یہ ایک initiative جو بہار ہی سے لیا گیا تھا، جس کا اوپر ذکر ہوا، اس پر بہار ہی عمل کرکے پورے ہندستان کو روشنی دکھا سکتا ہے۔ اس سے ہندو مسلم اتحاد کی ایک اور شمع روشن ہو اٹھے گی۔ اور وہ اس طرح کہ راجن بابو نے جیسے اپنی آتم کتھا میں سرل ہندی، سرل اردو شبد، رواں دواں استعمال کئے ہیں، راجندر پرشاد کی آتم کتھا اور مودی بھائی کی بول چال کی زبان بھی ہمیں روشنی بخش سکتی ہے۔ ان دونوں وِیکتیوں کو نمونہ بنا کر، بہار پورے دیس کی رہنمائی کر دے، تو کوئی عجب بات نہ ہوگی۔

(۱۵ نومبر ۲۰۲۱ء)

☆☆☆

Aligarh Diaspora - 18

Launched to mark the Finalé (December 2021) of AMU Centenary Celebrations 2020-21

From: Alig Brotherhood
علیگ عزیزوں کے خط

-

To start something is difficult but to keep it regular is more challenging! Sharing you my few books related to Aligarh Movement.
Atif Hanif, Mob. 9839026995

Aligarh diaspora is a great job that you have undertaken. Salutations.
Abdul Ghafoor danish
Riyadh, Mob.+966504682196

Thank you very much for giving the details of that unfortunate incident *(Ali Yawar Jang incident)* in which our newly arrived V.C., a very decent gentleman, Mr. Ali Yawar Jung, had to suffer severe injuries due to mishandling of the whole situation by some of our administrators of that time.
We will always remain ashamed for that, may Allah forgive those who were involved in this incident. It was his greatness to pardon all the suspected individuals. (Dr Jawed Aziz, MD)
1961-1976, Sulaiman Hall, East block & Kashmir House

I have seen the bulletin which contains the reflections of the AMU diaspora on valuable aspects. I sincerely appreciate and respect your time and devotion to this noble work in public interest.
Arshi Khan

I have regularly been reading the *Diaspora* sent by you. Your contribution as usual has been really immense without any doubt.
I know you since you were involved with Hakim Saheb's contribution brought out in four volumes.
I really marvel your hard work and choice of your topics. Though I am not familiar with many big wigs from Aligarh and Sir Syed's Academy in AMU, still some of the contributions are really there to tell us a lot.
May Allah give strength to you to contribute in such important areas in time to come. (S. Ahmad)

About a year back I had tried to contact you by giving all relevant reference about myself but possibly the communication was lost! I remember meeting you in Engineering Hall (=Suleman Hall) during those years. I am : Asad Murtaza; stayed at Nasrullah, VM Hall; 1954-64. Did my M.Sc, Physics 1963 Enrolment: D-4648
I do read your articles with interest. (Asad Murtaza, Austrailia)

Please accept my sincere apology for not writing or replying since many months. It is due to the engagements in some important life issues. In Sha Allah, I will make sure to keep regular contact in the days to come. Salam and Duas to everyone in your domain.
Shah Umer Ata

Aapney meri zindagi barbad karney mein koi kasar nahin chhori. Aap chahtey hain maen wapis na jaoon aur yahin
Aligarh key taraney aur 2 roti 2 boti ke qissey sunoo aur sunaoon. AMU key zamaney mein kisi ashad zaroorat sey maen ek moaziz official sey mila tha. Apni dastan sunai, mdad ki darkhast ki. Woh bahut der tak aakhein band kiye chup chap baithey rahey. Aakhir kar aankhain kholi aur kaha "yeh mumkin na hoga".
Zameer Ansari, Dubai

آپ کی فرمائش سر آنکھوں پر۔ لیجیے حاضر ہوں۔ میں نے اپنے علیگڑھ مسلم یونیورسٹی کے تجربات اپنی کتاب ، گردو بیش، کے ایک مضمون میں قلم بند کیے ہیں۔ مزید تفصیل اپنی انگریزی میں سوانح حیات NAZRA to New Jersey میں لکھ رہاہوں۔ انشااللہ جلد منظر عام پر آئے گی۔
ویسے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے متعلق کئی دلچسپ حکایتیں میری کتاب An Autobiography of my Dreams میں بھی شامل ہے ، جسے مسلم یونیورسٹی پبلی کیشنز نے شایع کیا ہے۔(حافظ شایق احمد یحییٰ)

---

kya ap whatsapp per hain? Ager hain tu, jis phone no. se hain, wo irsal karain tu mashkor hunga, whatsapp per messages arsal karne main, zyada asani huti hay, mere pas ap ka Jo pH No. hay, us per ap whatsapp per hain tu zaror, lekin ghaliban, ap us ko istemal nahi kar rahe hain.
Mukhlis, Iftikhar Alam

جی ہاں۔ مگر کچھ کہا اور لکھا نہیں۔ ان دونوں کے لئے صحت ابھی تیار نہیں۔(انور معظم)

I sincerely thank you for sending two attachments which I have downloaded and saw articles in Urdu and English.
Prof. Arshi Khan

Sorry. I just saw this email. I do need to recall the sher; will check.
We all know that Narang sahib wax not a poet.
I am surprised that some one has quoted that, as his sher.
Either we heard it wrong or it was a slip of tongue. The panellists were well informed. I would be surprised if any of them consider him as poet. (Abdullah)
ڈاکٹر عبداللہ ،جنہوں نے نارنگ کی یاد میں امریکہ میں شاندار محفل سجائی تھی، جس میں جس میں فرزن ا

بھی شریک تھے، افتخار عارف بھی شریک تھے، ان سے کہا جائے کہ شرکا کے نام بھیج دیں، اور کچھ چھاپا ہو تو وہ بھی بھیج دیں، تاکہ ہم ڈائسپورہ میں شامل کر لیں۔

شعر شاید افتخار عارف نے پڑھا تھا، یہ کہہ کر کہ شمس الرحمن کی وفات پر نارنگ نے تعزیتی جلسے میں یہ شعر پڑھا تھا: شعر کچھ ایسا تھا:

جب تو ہم کچھ نہیں کہتے تھے، پر اب کہتے ہیں
عشق کا لطف گیا، غیر کے مر جانے سے (ع ر ب)

Sorry to be late! Meanwhile, I have been busy & additionally, undergoing treatment of some ailments in my eyes.

I have gone through the latest copy of your magazine; all articles found fine, especially on "Ali Muhammad Khusro"---a noble descendant of H. Ali..... I also composed a 'midhat' on hazrat Ali, shall send, Insha-Allah !

Arif Rasheed, Saharanpur

Receipts Acknowledged by:

ڈائسپورہ کی رسید، بلکہ پورا پورا فارسی مصدر "رسیدن" : جن عزیزوں سے اطلاع ملی، ان کے نامِ نامی مندرجہ ذیل ہیں :

1. Salman Khalil, Aligarh
2. Shaheen Nazar, Delhi
3. Wajihuddin, Mumbai
4. Zafarul Islam Islahi
5. Naved Masood
6. Atif Hanif (Riyaz)
7. Jawaid Aziz of Suleman Hall
8. Sha'iq Ahmad Yahya
9. Anwar Muazzam
10. Arshi Khan
11. Dr. Abdullah (America)
12. Naim Syed

Thanks for Acknowledgements.

عزیز گرامی اطہر فاروقی صاحب کو بہت سی دعائیں۔
ارمغان فاروقی دیکھی جی خوش ہو گیا۔
آپ علی گڑھ میں کب تھے؟ یا کبھی نہیں؟ (عابد رضا بیدار)

جواب:
سلام۔ توبہ کیجیئے، حضور۔ (اطہر فاروقی)

اوپر کے سوال جواب پڑھنے کے بعد رشید صاحب (رشید احمد صدیقی) نے ہمیشگی کی دنیا سے اپنا مشہور دوہرہ دوہرایا: "سفر میں کوئی اچھا آدمی اچھی گفتگو کرنے والا مل جاتا ہے تو پوچھتا ہوں علی گڑھ کے طالب علم ہو؟ 'ہاں' میں جواب ملتا ہے تو دل خوش ہو جاتا ہے۔ 'ناں' میں جواب ملتا ہے تو افسوس ہونے لگتا ہے کہ وہ علی گڑھ کا کیوں نہ ہوا"۔ اطہر فاروقی صاحب کے بارے میں **گویا** رشید صاحب کا ایک پیغام آیا، تو میں نے اطہر فاروقی صاحب کا جواب رشید صاحب کو بھیجنے کی کوشش کی، ضرور ملا ہوگا۔ میں نے رشید صاحب کے جواب کا انتظار نہیں کیا ہے، کیوں کہ وہ پہلے ہی **گویا** اپنا جواب رقم کر چکے تھے۔

آپ کے جواب کا بہت بہت شکریہ۔ میں نے سوچا کہ کتاب دوبارہ پڑھی جائے تو ملی نہیں۔ اگر آپ پی ڈی ایف یا لنک بھیج دیں گے تو بہت مہربانی ہو گی۔
دریہ بھی آپ سب لوگوں کو سلام کہہ رہی ہے۔
نیاز مند، نعیم سید

عزیز گرامی، جیتے رہیں، خوش رہیں۔
کئی ہفتے پہلے آپ کا خط آیا تھا، کہ "کتاب دوبارہ پڑھی جائے" شاعر لوگ بڑی خوبصورت ترجمانی کر دیتے ہیں، یہ شعر خوبصورت بھی ہے، اور یاد بھی خوب آیا:۔

اتنے دن بیتے کہ بھولے سے تری یاد کبھی
آئے تو آنکھ میں آنسو بھی نہیں آتے ہیں

شعر برمحل اور باموقع نہ سہی، مگر مزے کا شعر ہے، لطف اٹھا لو۔ اور کہنے کا مقصد یہ ہے کہ جس کتاب کے بارے میں آپ نے اپنے خط میں لکھا تھا اس کا نام لکھیے تو بھجواؤں۔
امید ہے آپ اور دریہ اور اہل خانہ مزے میں ہوں گے۔
دعاؤں کے ساتھ، تمہارا ماموں،

With due respect, please find attached herewith my letter in Urdu for your kind perusal.
Heartiest wishes. (Shah Umer Ata)

10 جون 2022: خوش دِلی سے آپ، اہل خاندان اور داعیان عشّاق کی خیر و عافیت اصل مافی الضمیر ہے۔ راہِ حیات کی اِس پُر خار اور پُر آشوب رزم گاہِ حق و باطل میں جہاں اخلاقی اور معاشرتی قدریں ریت کی مانند ہاتھوں سے پھسلتی جا رہی ہیں۔ جہاں تہذیبی، تمدنی، مذہبی اور بھائی چارگی اور اعتدال سرعت سے مفقود ہوتا جا رہا ہے۔ جہاں عقل و خرد کی جگہ اب بے جا نفرت و عداوت اپنا جارحانہ تصّرف قائم کرتی نظر آتی ہے، وہیں "علیگڑھ ڈائسپورا" کے صفحات اپنے روح آگیں مضامین کے جلو میں یکسر اور منفرد انداز سے دعوت و عزیمت کی پیغام رسانی میں مصروف بہ عمل نظر آتے ہیں۔ یوں کہنا بجا ہو گا کہ یہ ہم تشنہ طلبوں کے لئے بہت بڑا اعزاز اور اکرام ہے۔

یہ جو آپ نے دانش و بینش کے قرطاس میں درج مختلف النوع اور نکتہ رساں تحاریر کو ایک نئی جہت عطا کی ہے، قابلِ ستائش اور ایقانیت سے مزیّن ہے۔ میں نے اِن ژرف نگاہ صفحات کو بغور اور دلچسپی کے ساتھ پڑھا اور یقین جانیے کہ ایک اکتشافی اور تخیلاتی لذت کا احساس ہوا۔

حسرت موہانی، بدر الدین طیب جی، جوش ملیح آبادی، سر سیّد علیہ الرحمہ، "کسی کی نظر لگ گئی"، عزیزوں کے خطوط اور جسٹس محمودؒ پر تحاریر گویا قاری کو کسی اور ہی اقلیم میں لے جاتی ہیں۔ یہ گراں بہاں مضامینِ صبا رفتار راہِ حیات کے اُن ادوار کے شاہد ہیں جب اولوالعزم، مخلص، انصاف پسند اور اہل الرائے داعیانِ علم و بصیرت صحیح معنوں میں انسانیت کی خدمت کو اپنا اصل نصب العین گردانتے تھے، خدائے بزرگ و برتر آپ اور آپ کے رفقاءِ کار کو اپنے حفظ و امان میں رکھے۔ (شاہ عمر عطا، برطانیہ)

***

قدیم رامپور

زندگی نے دو بڑے آدمی میرے حصے میں ڈال دیئے: قاضی صاحب (قاضی عبدالودود) اور عرشی صاحب۔

عرشی صاحب کا نام سنتا تھا جب سے کتابیں دیکھنا پڑھنا شروع کی تھیں۔ غالب سے نویں دسویں میں شناسائی ہو چکی تھی۔ پھر پتا چلا غالب پر عرشی صاحب نے زبردست کام کیا ہے، رضا لائبریری کے لائبرین ہیں۔ دس بجے بند قلعے کی چھوٹی کھڑکی تھپتھپانے پر دروازہ کھل جاتا ہے۔ لائبریرین صاحب کے داخل ہونے کے بعد بند ہو جاتا ہے۔ ہمارے اوپر یہ دروازہ دو تین سال بعد کھلا جب آزادی کے بعد پبلک کے لئے وا ہوا۔

یہ 49/1948 کی بات رہی ہو گی۔ لائبریری اس وقت کتاب خانہ عالیہ ریاست رامپور یا رامپور اسٹیٹ لائبریری کے نام سے مشہور تھی۔ اور اس وقت اس عمارت میں تھی جہاں آج کل آئی آئی ٹی (IIT) کے دفاتر سامنے کی طرف اور اس کی کارگاہ پچھلی طرف واقع بلڈنگ میں ہے۔ لائبریری کی متصلہ عمارت محافظ خانہ کہلاتی تھی، جسے اسٹیٹ آرکائیوز (State Archives) کہہ لیجئے، مشرقی کونے میں مہمان خانہ تھا جس میں دو ایک اسکالروں کے ٹھہرنے کا انتظام تھا۔

رامپور کے سب سے قدیم اور سب سے بڑے محقق کلب علی خاں فائق، ہمارے استاد پڑوسی اور ایک طور سے چچا گورے میاں کو میں نے کوئی مضمون لکھ کر دکھایا، انہوں نے کہا، تمہیں اپنے دوست کلب علی خاں سے ملوا دوں گا، انہیں ایسی تحریروں کا خاص ذوق ہے۔ مضمون کا عنوان شاید انشااللہ خاں انشا کا سال پیدائش تھا۔ فائق صاحب جامع مسجد کے نیچے ملکیوں کے گھیر میں رہتے تھے۔ ملکیوں کے پانچ چھ گھروں میں ایک انکا بھی تھا۔ باقی دو ایک گھروں میں تالا پڑا تھا، جہاں کسی زمانے میں، ایک پرنٹنگ پریس (Printing press) بھی تھا، عزیز اللہ خاں جس کے مالک تھے۔ کسی زمانے میں رسالہ "تہذیب" اور رسالہ "نیرنگ" بھی وہیں سے نکلتے تھے۔ عزیز اللہ خاں رسالہ نیرنگ کو عشرت رحمانی کی ہمکاری میں نکالتے تھے۔ عشرت رحمانی بعد میں اسے رامپور سے دہلی لے گئے، جہاں سے وہ مزید کئی سال مزید نکلا۔

اپنے عہد کے آٹھ دس بڑے پرچوں میں سے تھا۔ اور آج دوسرے اہم رسائل کی طرح مخطوطے کا درجہ رکھتا ہے۔ یہ ادبی پرچہ تھا۔ عشرت صاحب بعد میں پاکستان جا بسے۔ پاکستان ریڈیو کے اکابر میں شوکت تھانوی، شاہد احمد دہلوی کی طرح ان کا نام بھی ریڈیو کے بڑوں میں آتا تھا۔

کلب علی خاں فائق نے بارِ دگر اپنے لکھنے کی ابتدا شاگردِ رشید کی طرف سے خدمت گزاری سے ہوئی جب میں نے ان کا عہد جدید کا پہلا مضمون "سودا کی عمر" **معارف** میں اشاعت کے لئے بھیجا۔ وہ شایع ہو گیا۔ شائع تو ہونا ہی تھا۔ پختہ عمر کی پختہ تر تحریر تھی۔ پھر ایک آدھ مضمون میں نے ان سے اور بھی لکھوایا، شیخ علی بخش بیمار پر، نظام پر، ادب اور سیاست پر۔
(۲۶ جولائی ۲۰۲۱ء)